

بسیط

احمد ندیم قاسمی

رفاقتیں

کون کہتا ہے کہ تنہائی مرا مقسوم ہے
میں نے مانا
میری ساری زندگی
ایک ناپیدا کراں صحرا میں گزری ہے
جہاں طوفان در طوفان یوں چلتے ہیں
جیسے شہر میں انسان چلتے ہیں
میں نے لیکن بارہا دیکھا کہ ہر طوفاں میں میرے ساتھ ساتھ
ریت کے ٹیلے سفر کرتے رہے!



اندھیری رات کو یہ معجزہ دکھائیں

اندھیری رات کو یہ معجزہ دکھائیں گے ہم
چراغ اگر نہ جلا اپنا دل جلائیں گے ہم

ہماری کوہ کنی کے ہیں مختلف معیار
پہاڑ کاٹ کے رستے نئے بنائیں گے ہم

جنوں عشق پہ تنقید اپنا کام نہیں
گلوں کو نوچ کے کیوں تتلیاں اڑائیں گے ہم

جو دل دکھا ہے تو یہ عزم بھی ملا ہے ہمیں
تمام عمر کسی کا نہ دل دکھائیں گی ہم

بہت نڈھال ہیں، ستا تو لیں گے پل دو پل
الجھ گیا کہیں دامن تو کیوں چھڑائیں گے ہم

اگر ہے موت میں کچھ لطف تو بس اتنا ہے
کہ اس کے بعد خدا کا سراغ پائیں گے ہم

ہمیں تو قبر بھی تنہا نہ کر سکے گی ندیم
کہ ہر طرف سے زمیں کو قریب پائیں گے ہم



تنگ آ جاتے ہیں دریا

تنگ آ جاتے ہیں دریا جو کہستانوں میں
سانس لینے کو نکل جاتے ہیں میدانوں میں

خیر ہو وشت نوردان محبت کی، کہ اب
شہر بستے چلے جاتے ہیں بیابانوں میں

اب تو لے لیتا ہے باطن سے یہی کام جنوں
نظر آتے نہیں اب چاک گریبانوں میں

مال چوری کا جو تقسیم کیا چوروں نے
نصف تو بٹ گیا بستی کے نگہبانوں میں

کون تاریخ کے اس صدق کو جھٹلائے گا
خیر و شر دونوں مقید رہے زندانوں میں

جستجو کا کوئی انجام تو ظاہر ہو ندیم
اک مسلماں تو نظر آئے مسلمانوں میں



چپکے سے فریب کھا لیا ہے

چپکے سے فریب کھا لیا ہے
ہم نے ترا بھید پا لیا ہے

گو لٹ گئے زندگی کے ہاتھوں
ہم نے ترا غم بچا لیا ہے

جب درد اٹھا تو رو دیئے ہم
پھر دیر تلک مزا لیا ہے

یاد آئے ہیں جب بھی دن سہانے
اشکوں میں بھی مسکرا لیا ہے

اے گل! تجھے پا ہی لیں گے اک دن
خوشبو سے ترا پتا لیا ہے

کیوں ظلمت وقت سے ڈریں ہم
جب دل کا دیا جلا لیا ہے

خورشید کو جب زوال آیا
ہر چیز نے قد بڑھا لیا ہے

بندوں نے خدا کی جستجو میں
بندوں کو خدا بنا لیا ہے

میں قیس کا ہم نصیب نکلا
ہر طفل نے سنگ اٹھا لیا ہے



جہاں سے بجلیاں گرنے لگی ہیں

جہاں سے بجلیاں گرنے لگی ہیں
وہیں سے ابر کو بوندیں ملی ہیں

دعائیں جب بھی مانگیں، یوں لگا ہے
کہ آندھی میں ابابیلیں اڑی ہیں

نئے طبقے تراشے مصلحت نے
چٹانیں کوہساروں سے بڑی ہیں

تجارت میں ترقی ہو رہی ہے
گھروں میں بھی دکانیں کھل گئی ہیں

ہوا چلتی تو منظر اور ہوتا ہے
وفور حبس سے شمعیں بجھی ہیں

وہ تنہائی کے سناٹے غضب تھے
کہ جن کی میں نے فریادیں سنی ہیں

میں جب اشعار کہنے بیٹھتا ہوں
تو صدیاں میری جانب دیکھتی ہیں



جب بھی آنکھوں میں تیری رخصت کا منظر

جب بھی آنکھوں میں تری رخصت کا منظر آ گیا
آفتاب وقت نیزے کے برابر آ گیا

دوستی کی جب دہائی دی، تو شرق و غرب سے
ہاتھ میں پتھر لیے یاروں کا لشکر آ گیا

اس سفر میں گو تمازت تو بہت تھی ہجر کی
میں تری یادوں کی چھاؤں سر پہ لے کر آ گیا

گو زمین وآ سماں مصروف گردش ہیں، مگر
جب بھی گردش کا سبب سوچا تو چکر آ گیا

آدمی کو حشر کے منظر نظر آنے لگے
اس کے قبضے میں جب اک ذرے کا جوہر آ گیا

حسن انساں دفن ہو جانے سے مٹتا ہے کہاں
پھول بن کر خاک کے پردے سے باہر آ گیا

اشک جب امڈے کسی بے کس کی آنکھوں میں ندیم
یوں لگا، طوفان کی زد میں سمندر آ گیا



حصارِ وقت کے سب زاویے

حصار وقت کے سب زاویے سیاہ ملے
میں راہ ڈھونڈنے نکلوں تو گردِ راہ ملے

میں اک عجیب سمندر میں ہوں اسیرِ حیات
نہ ساحل اس کا ملے اور نہ اس کی تھاہ ملے

دل و دماغ تھے' سن اور منجمد تھے ضمیر
مجھے تو جتنے تونگر ملے' تباہ ملے

خدا کے عدل سے کس طرح رہ گئے محفوظ
غریب قوم کو جو صاحبانِ جاہ ملے

گزر رہی ہے طوافِ انا میں عمر ندیم
یہ دائرہ کبھی ٹوٹے تو گھر کی راہ ملے



آمد آمد

دست خورشید سے دروازہ شب بجتا ہے
ظلمتیں اپنی قباؤں کو اڑاتی بھاگیں
پو کی تلوار مگر ان کے تعاقب میں ہے
اور ستارے ہیں کہ بجھنے بھی نہیں پاتے
صبح کے ڈر سے کہیں ڈوب کے رہ جاتے ہیں
ظلمت شب کے ستائے ہوئے آدم زادو!
سن سکو تم تو ذرا گیت شعاعوں کا سنو:
راہ میں یوں تو اندھیروں کے پہاڑ آتے ہیں
جن کو آنا ہو وہ ہر حال میں آ جاتے ہیں



عدم تجربہ

مجھے زندگی سے گریز کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہوا
مجھے ماورا کے جمال سی کوئی کد نہیں
مگر اس زمیں پہ جو آدمی ہیں
میں ان کے چہروں کو ان کے ذہنوں کو اپنے دل میں تارلوں تو ادھر
چلوں
میں سمندر کو سمیٹ لوں تو ادھر چلوں
یہ جو ریگ زار ہیں' کوہسار ہیں' سبزہ زار ہیں
ان کے حسن کو اپنے گرد لپیٹ لوں تو ادھر چلوں
مری کائنات طلوع بھی ہے' غروب بھی
مری سلطنت میں شمال بھی ہے' جنوب بھی
یہ مری زمیں کا جو فرش ہے
مرا عرش ہے
میں بلند ہو کے بھی خاک سے ہوں بندھا ہوا
کہ مرے وجود کی جڑ تو میری زمین میں ہے
یہ زمیں جو کعبہ زندگی ہے
جو سجدہ گاہ فنون ہے
یہ زمیں ہی میرا شعور ہے
یہ زمیں ہی میرا جنون ہے
مجھے زندگی سے گریز کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہوا!



زندگی کے بارے میں ایک گفتگو

سب کی بات نہیں
یہ میری اپنی بات ہے
اپنا ذکر ہے
زندگی کے بارے میں میری اپنی فکر ہے
وہ میزان الگ رکھ دو
جو صدیوں صدیوں برے بھلے کو تولتے تولتے
وزن کو بھی بے وزن بنا دیتی ہے
یا بے وزن کو بھی باوزن دکھا دیتی ہے
میں تو اپنی بات کروں گا
اور اپنی میزان میں
اپنا اور پھر اپنی فکر کا وزن کروں گا
اپنا ذکر کروں گا

بات یہ ہے:
میں جب تک زندہ رہا
مجھے رشتے چار عزیز رہے
میں جب تک زندہ ہوں
یہ چاروں رشتے میرا مقدر' میری مسرت' میری محبت' میری عبادت ہیں!
اک رشتہ جسم کا ہے
اک جان کا ہے
وجدان کا بھی اک رشتہ ہے

اور اک رشتہ انسان کا ہے

میں ان چاروں کی ریشمی ڈور میں بندھا ہوا ہوں

اور خوش ہوں

میں اتنا خوش ہوں

جتنا اک بچہ پانی میں چاند کے عکس کو چھو کر پھولے نہیں سماتا ہے

اور ہنستے ہنستے پاگل سا ہو جاتا ہے

جو رشتہ جسم کا ہے

وہ قدرت کی اک دین ہے

ہر انسان اس رشتے کی تخلیق ہے

آنے والا ہر انسان اس رشتے کا مرہون ہے

اس رشتے کے اپنے سکھ اور اپنے دکھ ہیں

سکھ پانا اور دکھ سہنا اس رشتے کی مجبوری ہے

ورنہ ہر بات ادھوری ہے

جو رشتہ جان کا ہے

دراصل وہ اپنی ہی پہچان کا ہے

انسان کا چہرہ اک آئینہ ہوتا ہے

پھر لاکھوں اور کروڑوں آئینوں میں سے اک آئینے میں

جب اس کو خود اپنا عکس دکھائی دیتا ہے

یہ رشتہ جسم کے رشتے سے بھی مقدس ہوتا ہے

اور اتنا مقدس' جتنا کوئی مقدس ہو سکتا ہے

جو رشتہ وجدان کا ہے

اور اتنا لطیف ہے

اتنا ہلکا پھلکا ہے

اور اتنا گداز ہے

اتنا نرم ہے

اتنا نازک ہے

جیسے اک پھول کی پتی پر

اک قطرہ اوس کا ہو

جس میں افلاک کا عکس

قریب و دور کے سب پیمانوں کو بے معنی کر دے

ایک دیے میں شمس و قمر کا سارا نور سمٹ آیا ہو

ایک ہی حرف میں ساری ابجد اتر رہی ہو

جو رشتہ انسان کا ہے

وہ میرے دل و دماغ کے میرے ظاہر و باطن کے ایمان کا ہے

یہ نفی نہیں، اثبات کا رشتہ ہے

یہ خواب نہیں، حق بات کا رشتہ ہے

میں اس رشتے سے ٹوٹ کے کچھ بن سکتا ہوں تو پتھر ہی بن سکتا ہوں

اور سانسیں لیتے انسان کا پتھر بن جانا ہے

موت کا دوسرا نام ہے

اور مجھے یہ موت قبول نہیں

یوں جیتے جی مر جانا مرا اصول نہیں



حواس خمسہ

مجھے ایک طفل کے ہاتھ
مٹی میں سن کے بھی
کبھی پھول
اور کبھی نجوم دکھائی دیں
مجھے سیدھی سادی سی
بھولی بھالی سی صورتیں
نظر آئیں خالق حسن فن کا کمال فن
لب مقتدر کے حروف نرم کے اس طرف
مجھی کتنی چیخیں سنائی دیں
شب خموش کے دامنوں سے نچوڑ لیں
میں گلاب سونگھ کے
اس کو ڈھونڈنے چل پڑوں
جو زمیں کا عطر نکال کر
کسی خس کدے میں نڈھال
اپنے خدا سے رزق حلال مانگتے مانگتے
پڑھی اپنے ہاتھوں کی مٹتی مٹتی عبارتیں
مجھے شہد زہر لگے
کہ جیسے میں چور ہوں
میں وہ پھل چراتا ہوں
جس میں کتنی مشقتوں کی مٹھاس ہے
میں کسی بدن کو ہوس کے جبر سے مس کروں

تو مثال شعلہ بھڑک اٹھیں

کہ امانتوں میں خیانتوں کی ندامتوں کا خیال

ایک الاؤ ہے

جو کسی طرح بھی تپش کی حد کو نہ کم کرے

جو ضمیر تک کو بھسم کرے



بس اک برزخ کے عالم میں

بس اک برزخ کے عالم میں ہوئی نشوونما میری
نہ صبح ابتدا میری' نہ شام انتہا میری

کچھ ایسے گونجتا ہے میری تنہائی کا سناٹا
کہ آتی ہے مسلسل میرے کانوں میں صدا میری

مری فطرت کا تو معمار ہے تو یہ سزا کیسی!
عجب انصاف ہے تیرا' رضا تیری' خطا میری

کسی سے سیکھ لیتا بے وفائی کا ہنر میں بھی
اگر معلوم ہوتا' بے ثمر ہو گی وفا میری

مجھے جب لفظ کی حرمت کا اتنا پاس رہتا ہے
تو پھر کیوں آسماں پر ٹھوکریں کھائے دعا میری

سنا ہے عہد ماضی میں تو اک آنسو ہی کافی تھا
نہ جانے عہد نو میں کیوں نہیں سنتا خدا میری



ایک درخواست

زندگی کے جتنے دروازے ہیں، مجھ پر بند ہیں
دیکھنا، حدِ نظر سے آگے بڑھ کر دیکھنا بھی جرم ہے
سوچنا، اپنے یقینوں سے نکل کر سوچنا بھی جرم ہے
آسماں در آسماں اسرار کی پرتیں ہٹا کر جھانکنا بھی جرم ہے
''کیوں'' بھی کہنا جرم ہے ''کیسے بھی'' کہنا جرم ہے
سانس لینے کی تو آزادی میسر ہے، مگر
زندہ رہنے کے لیے انسان کو کچھ اور بھی درکار ہے
اور اس ''کچھ اور بھی'' کا تذکرہ بھی جرم ہے

اے ہنرمندانِ آئین وسیاست!
اے خداوندانِ ایوانِ عقاید!
زندگی کے نام پر بس اک عنایت چاہیے
مجھ کو ان سارے جرائم کی اجازت چاہیے



میری تنہائی کا اک عالم تماشائی

میری تنہائی کا اک عالم تماشائی بھی ہے
انجمن آرائی بھی ہے اور یکتائی بھی ہے

حسن کو اعصاب میں رچنے سے روکوں کس طرح
جب مری سوچوں میں شامل میری بینائی بھی ہے

جیسے خود قدرت نے کر دی ہو تری مشاطگی
سادگی بھی ہے مگر اک شان رعنائی بھی ہے

اک عجب مجموعہ اضداد ہے میرا وجود
گنگ ہے میری زبان اور ذوق گویائی بھی ہے

شاعری سرمایہ شہرت سہی لیکن ندیم
شعر کہنے میں جو راحت ہے تو رسوائی بھی ہے



وہ کتنی سادگی سے اپنی

وہ کتنی سادگی سے اپنی جاں گنوا بیٹھے
مکان گرنے کے ڈر سے چھتوں پہ جا بیٹھے

عجب تھے ہم بھی کہ سیلاب کے اترتے ہی
کنار آب رواں بستیاں بسا بیٹھے

صدا جو دی تو پلٹ کر ہمیں پہ آ کے گری
ہم ایک بار خدا کو جو آزما بیٹھے

ہم اک درخت سے، یہ سوچ کر جدا نہ ہوئے
پرند ٹوٹی ہوئی شاخ پر نہ آ بیٹھے

فریب کھانے کو پیشہ بنا لیا ہم نے
جب ایک بار وفا کا فریب کھا بیٹھے

کسے خبر تھی کہ ترک تعلقات کے بعد
وہی تو یاد رہیں گے جنھیں بھلا بیٹھے

ندیم ہم کو تو اس جرم کی ملی ہے سزا
کہ عدل مانگنے کو ہاتھ کیوں اٹھا بیٹھے



اشعار

جو میں دیکھتا بھی تو کب تلک ترے باغ پھولے پھلے ہوئے
کہ مری نظر میں، آج بھی پس سبزہ قریے جلے ہوئے

یہ جو آدمی ہیں، انھیں کبھی کسی دور میں بھی سکوں نہ تھا
ہیں ابھی ہدف کی تلاش میں یہ ازل سے تیر چلے ہوئے

مجھے حال و ماضی کے آئینے میں بس اک شبیہ دکھائی دی
کبھی سر پہ تاج رکھے ہوئے، کبھی منہ پہ راکھ ملے ہوئے



اپنے آنگن میں تو وہ

اپنے آنگن میں تو وہ سرو و صنوبر ہوں گے
سامنے آئے تو کب میرے برابر ہوں گے

میں نے مانا کہ وہ حد درجہ تونگر ہوں گے
اس سے لازم نہیں آتا کہ ہنرور ہوں گے

اب جو سلطانیٔ جمہور کا دور آیا ہے
اس میں بھی کیا وہی دارا و سکندر ہوں گے!

کوہ و صحرا میں بھٹکتے ہیں، مگر یاد رہے
جب بھی یک جا ہوئے دریا، تو سمندر ہوں گے

کب یہ سوچا تھا کہ جب حبس سی نکلوں گا ندیم
وہی رستے، وہی راہی، وہی رہبر ہوں گے



نمو

درخت تم نے جہاں سے کاٹا' وہیں سے اک شاخ اگ رہی ہے
تم اتنے حیران کیوں کھڑے ہو' یہی تو آئین زندگی ہے

نمو تو آہن مزاج ہوتا ہے کاٹ دیتا ہے پتھروں کو
جو ہو سکے تو کبھی گریبان سنگ میں جھانک کر بھی دیکھو

وہاں بہت نرم گھاس کی پتیوں میں شبنم کا راج ہو گا
چٹان کا بھی نمو کے بل پر گلاب کا سا مزاج ہوگا

یہی تو روئیدگی کی خو ہے' یہی تو ہے کائنات سازی
کہیں نہ رکنا' کہیں نہ تھمنا یہی نمو کی ہے سرفرازی



اپنی ۲۷ ویں سالگرہ پر

دل میں یہ برف زار سا کیا ہے!
انجماد انجماد چار طرف
کوئی ہلچل نہیں قریب و دور
نہ کوئی آرزو نہ کوئی امید
پھر بھی یہ انتظار سا کیا ہے!

صبح کس غار میں سے جھانکے گی
اور سورج کدھر سے نکلے گا
نور پھوٹا تو بجھ نہ جائے کہیں
نور پھوٹا تو بجھ نہ جائے کہیں
پھر بھی، اس مردنی کے عالم میں
روشنی کا حصار سا کیا ہے!

اکھڑی اکھڑی ہوا بھی ٹھٹھری ہوئی
سہمی سہمی فضا بھی برفانی
چار سو اک سفید سناٹا
پھر بھی، میرے لہو میں گھلتا ہوا
زندگی کا خمار سا کیا کیا ہے



لاتعداد

ابھی وقت کے ہاتھ میں

ایک شاخِ شکستہ تو ہے

اس کے سائے میں چلنا

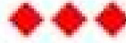
بڑا لطف دے گا

کہ جو سورجوں کی تمازت میں جلتے رہے

یہ نہیں دیکھتے

ان پہ جس شاخ کی چھاؤں ہے

اس میں پتوں کی تعداد کیا ہے



جس در پر دستک دوں

جس در پر دستک دوں اس کا در ہوتا ہے
حادثہ میرے ساتھ یہی اکثر ہوتا ہے

اب کے برس تو درد کچھ اتنے عام ہوئے ہیں
جو دامن تھاموں اشکوں سے تر ہوتا ہے

روتے بچے کو میں اگر اک بار ہنسا لوں
جبر زمانہ میری ٹھوکر پر ہوتا ہے

آئینہ تو دیکھو اے بے چہرہ لوگو!
انسانوں کے شانوں پر تو سر ہوتا ہے

ایک مذاق ہے وشت کی پہنائی کے مقابل
دیواروں میں گھرا ہوا جو گھر ہوتا ہے

سناٹوں کی گونجیں بھی پیاری ہوتی ہیں
یہ اندازہ زنداں میں جا کر ہوتا ہے

ہر انسان کا وقار امانت ہر انسان کی
ہر انسان میں ایک نہ اک جوہر ہوتا ہے



لوگ مصروف خودنمائی میں

لوگ مصروف خود نمائی میں
اور میں کرب انتہائی میں

قید میں نے بہار دیکھی ہے
حسن کے پنجہ حنائی میں

میں وہ گلزار ہوں کہ جس کے رنگ
جل گئے ابر کی جدائی میں

اے خدا! کاش مجھ کو مل جاتا
اک شناسا بھری خدائی میں

مجھ کو توفیق رہنمائی کہاں
میں کہ یکتا ہوں بے ریائی میں

اپنا ہی عکس پوجتا ہو گا
آدمی دور ابتدائی میں

اے عزازیل! اک گناہ کی بھیک
سانس گھٹتی ہے پارسائی میں

راستے جب ہوئے طویل ندیم
لطف آیا برہنہ پائی میں



آپ ہی اپنا تماشائی ہوں

آپ ہی اپنا تماشائی ہوں
میں مبصر ہوں کہ سودائی ہوں

نہ کوئی چاندؔ نہ تاراؔ نہ امید
میں مجسم شب تنہائی ہوں

ہے سفر شرط مجھے پانے کی
میں کہ اک لالہ صحرائی ہوں

سیدھے رستے پہ چلوں تو کیسے
بھولی بھٹکی ہوئی دانائی ہوں

مجھ سے خود کو نہ سمیٹا جائے
اور خدائی کا تمنائی ہوں

میرے ماضی کے اندھیروں پہ نہ جا
صبح آئندہ کی رعنائی ہوں

کاش یہ جانتا دشمن میرا
میں ہر انسان کا شیدائی ہوں

میں پہاڑوں کی خموشی ہوں ندیم
اور میں بحر کی گویائی ہوں



ایک نظریے کا نوحہ

وہ جو عشق پیشہ تھے
دل فروش تھے
مر گئے!
وہ ہوا کے ساتھ چلے تھے
اور ہوا کے ساتھ بکھر گئے
وہ عجیب لوگ تھے
برگ سبز کو برگ زرد کا روپ دھارتے دیکھ کر
رخ زرد اشکوں سے ڈھانپ کر
بھرے گلشنوں سے
مثال سایہ ابر
پل میں گزر گئے
وہ قلندرانہ وقار تن پہ لپیٹ کر
گھنے جنگلوں میں گھری ہوئی کھلی وادیوں کی بسیط دھند میں
رفتہ رفتہ اتر گئے!



ہجرت

یہ ٹیلا وہی ہے

جہاں ریت کے گھر بنا کر ہم اٹھے

تو آندھی چلی

اور ٹیلے کو ہجرت پہ مجبور ہونا پڑا

اور مہاجر گھروں کو سروں پر اٹھا کر تو چلتے نہیں

وہ تو صرف اپنے جسم اور روحیں بچا کر

کسی گوشہ امن کی جستجو میں

گھروں سے نکلتے ہیں

اور لوٹ جانا نہیں جانتے

یہ وہ ٹیلا ہے جو سالہا سال پہلے

یہاں سے کئی کوس پر تھا

مگر آندھیاں اس کے ذرات کو جا بجا لے کر پھرتی رہیں

میں ادھر سے جو گزرا

تو ٹیلے کے اطراف سے ایک خوشبو نے مجھ کو ملایا

مجھے میرے ماضی کی جھولی میں لا کر بٹھایا

یہ بچپن کی خوشبو

جو ٹیلے کے ہمراہ ہجرت کے عالم میں

میری پہچان ہے

یعنی میں تو ہجرت میں ہوں

زندگی کا سفر میری ہجرت نہیں ہے تو کیا ہے؟



ہمیشہ ظلم کے منظر ہمیں دکھائے گئے

ہمیشہ ظلم کے منظر ہمیں دکھائے گئے
پہاڑ توڑے گئے اور محل بنائے گئے

طلوعِ صبح کی افواہ اتنی عام ہوئی
کہ نصف شب کو گھروں کے دیے بجھائے گئے

اب ایک بار تو قدرت جواب دہ ٹھہرے
ہزار بار ہم انسان آزمائے گئے

فلک کا طنطنہ بھی ٹوٹ کر زمیں پہ گرا
ستون ایک گھروندے کے جب گرائے گئے

تری خدائی میں شامل اگر نشیب بھی ہیں
تو پھر کلیم سرِ طور کیوں بلائے گئے

یہ آسماں تھے کہ آئینے تھے خلاؤں میں
مہ و نجوم میں جھانکا تو ہم ہی پائے گئے

درازِ شب میں کوئی اپنا ہم سفر ہی نہ تھا
مگر ندیم صدائیں تو ہم لگائے گئے



مہ و مشتری پہ اتر کے بھی

مہ و مشتری پہ اتر کے بھی میں زمین سے جدا ہوا
مجھے اپنی خاک سے عشق ہے کہ میں خاک کا ہوں بنا ہوا

سفرِ حیات کے موڑ پر میں یہ سوچ کر بھی رکا نہیں
کفِ پا ہیں میرے جلے ہوئے مرا راستہ ہے تپا ہوا

میں ترے کرم کا ہوں معترف، ترا شکر کیسے ادا کروں
مرے زخم تیری عطائیں ہیں، مرا درد تیرا دیا ہوا

مری منزلوں کے نشاں ہیں گم، اسی راکھ میں، اسی ریت میں
مری مشعلیں ہیں بجھی ہوئی، مرا قافلہ ہے لٹا ہوا

مری عمر گزری ہے دوستو! اسی اک تجربے کی کھوج میں
مجھے کاش آپ دکھا سکیں کوئی دل جو ہو نہ دکھا ہوا

وہ جو ایک نقطۂ نور تھا مری عقل میرا شعور تھا
جو سمجھ لیا تو صنم بنا، نہ سمجھ سکے تو خدا ہوا

وہ جو مر گئے ہیں ندیم وہ تو فنا کے گھاٹ اتر گئے
مگر ایک دوست جو زندہ ہے، وہ پلٹ سکا نہ گیا ہوا



میں نخیلِ دوراں ہوں بنجروں

میں نخیلِ دوراں ہوں، بنجروں میں چلتا ہوں
دھوپ کی تمازت میں، پھولتا ہوں، پھلتا ہوں

میری تند سوچوں کے بے شمار موسم ہیں
آگ سا مچلتا ہوں، برف سا پگھلتا ہوں

کیوں گلہ کسی کو ہو، میری نارسائی کا
اپنا خون پیتا ہوں اپنے ہاتھ ملتا ہوں

منزل اپنی پا لینا پاؤں توڑ لینا ہے
میں تو مثلِ بوئے گل، چار سمت چلتا ہے

میں تری نوازش کو عمر بھر نہ بھولوں گا
میں چراغِ ماضی ہوں، حافظے میں جلتا ہوں

میں خدا کا شہ پارہ بے نشاں رہوں کیسے
اس لیے تو گل بن کر قبر سے نکلتا ہوں



بھیک

تم گداگر کے گداگر ہی رہے
تم نے کشکول تہ جامہ بانات چھپا رکھا تھا
اور چہرے پہ انا تھی
جو ہمیشہ کی طرح جھوٹی تھی
وہ یہ کہتی ہوئی لگتی تھی کہ ہم بھیک نہیں مانگیں گے
یعنی مر جائیں گے لیکن کسی منعم کے در زر پہ نہ دستک دیں گے
یہ جو گرتے ہوئے سکوں کی کھنک چار طرف گونجی ہے
یہ شنیدہ ہے کئی برسوں کی
اور کشکول کا لہجہ بھی وہی ہے جو ہمیں ازبر ہے
لاکھ انکار کرو لاکھ بہانے ڈھونڈو
تم گداگر کے گداگر ہی رہے



کوئی ہے جو آنکھ اٹھا سکے

کوئی ہے جو آنکھ اٹھا سکے مرے خوش جمال کے سامنے؟
کوئی فلسفہ نہ ٹھہر سکا مرے اس سوال کے سامنے

وہ سحر کا نور ہے یا نجوم جبین شب پہ سجے ہوئے
کوئی اک مثال نہ جم سکے مرے بے مثال کے سامنے

نہ میں اپنے آپ کو پاسکا' نہ میں شش جہت میں سما سکا
کہ یہ کائنات ہے اک نقطہ مرے خیال کے سامنے

ہے بلند کتنا یہ مرتبہ کہ میں خاک چاٹ کے جی لیا
بھلا حیثیت ہے کسی کی کیا' مرے اس کمال کے سامنے

فقط اتنا پوچھوں گا' اے خدا مجھے بھول کر تجھے کیا ملا؟
اگر اتفاق سے آ گیا کبھی ذوالجلال کے سامنے



ابھی انسان نے پایا نہیں

ابھی انسان نے پایا نہیں جوہر اپنا
اور بضد ہے کہ مقدر نہیں یاور اپنا

اب بھی سینے میں ہیں روشن مرے خوابوں کے چراغ
گھر اندھیرا ہے مگر دل ہے منور اپنا

میں کسی روز قیامت کا نہیں ہوں محتاج
اپنے اندر ہی بپا رکھتا ہوں محشر اپنا

ایک چہرہ سبھی چہروں میں نظر آتا ہے
اس بھروسے پہ ہر انسان ہے دلبر اپنا

ایک دل میں بھی مری یاد اگر زندہ ہے
کیا ضروری ہے کہ چرچا رہے گھر گھر اپنا

کوچ کے حکم کا امکان ہے ہر ہر لمحہ
روز اول سے بندھا رکھا ہے بستر اپنا



مسافرت میں یہ مجھ پر

مسافرت میں یہ مجھ پر عجیب وقت پڑا
چلی جو ناؤ مریٔ خشک ہو گیا دریا

کسے خبر تھی کہ قزاق بھی وہی ہو گا
مجھی کو لوٹنے آیا ہے میرا راہ نما

اس اعتماد کے ہاتھوں بڑے عذاب میں ہوں
مجھے تو اپنے عدو پر بھی شک نہیں ہوتا

ہر ایک نقش کف پا میں پھول کھلتے رہے
میں خار زار محبت میں پا برہنہ چلا

یہ جی میں تھا کہ بس اک بے وفائی کر دیکھیں
بھرے جہان میں کوئی نہ مل سکا تجھ سا

خرام وقت میں آہنگ کوئی کھیل نہیں
یہ کائنات پہ احسان ہے محبت کا

مرے سوال کا یا رب کوئی جواب تو دے
اسے برسنا نہیں تھا تو ابر کیوں امڈا

حقیقتوں میں خود اپنی بھی ذات کر شامل
غضب کی تیرگیاں ہیں مگر دیا تو جلا

مرے غنیم نے جب میری مٹھیاں کھولیں
تو ان میں صرف لکیریں تھیں، اور کچھ بھی نہ تھا

جو شعر و نغمہ سے ذہنوں کو مرتعش کر دے
وہ مر تو سکتا ہے، لیکن گزر نہیں سکتا

بس ایک مرحلہ مرگ رہ گیا ورنہ
خدا کو پانے کی خاطر ندیم کیا نہ کیا



شاعری فن بھی ہے اور زیست

شاعری فن بھی ہے اور زیست کی تفسیر بھی ہے
یہ مرا خون بھی ہے، خون کی تحریر بھی ہے

ورنہ یاروں نے تو کچھ کسر نہیں چھوڑی تھی
میں جو زندہ ہوں تو اس میں مری تقصیر بھی ہے

لے تو لوں دست دعا میں ترا دامن یا رب!
یہ مرا حق ہے مگر خطرہ تکفیر بھی ہے

چاند اترا جو زمیں پر تری صورت اترا
خواب وہ دیکھا ہے جس کی کوئی تعبیر بھی ہے

لوگ چلتے ہیں مقابر سے ذرا ہٹ کے ندیم
یعنی اس دور میں انسان کی توقیر بھی ہے



زندگی کا فقط گماں ہوتا

زندگی کا فقط گماں ہوتا
وہ نہ ہوتا تو میں کہاں ہوتا

اس کی آنکھیں ہیں پیار سے لبریز
کاش یہ لمحہ جاوداں ہوتا

کاش ہوتا مرا بھی گھر کوئی
اور وہ میرا مہمان ہوتا

اس صداؤں کے حشر میں یا رب!
کوئی تو میرا ہم زباں ہوتا

عقل پڑتی نہ بیچ میں تو ندیم
دل کا سودا بہت گراں ہوتا

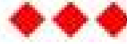
وہ جو اپنا مزاج داں ہوتا
آدمی کتنا بے کراں ہوتا

ایک ہوتے جو خالق مخلوق
کیسے ابلیس درمیاں ہوتا

ہم نہ کھاتے اگر فریب نظر
چار سو آسماں کہاں ہوتا

تب ہی کچھ ملتا لطف آزادی
مجھ پہ جب میں ہی حکمراں ہوتا

تب مزہ آتا زندگی کا ندیم
جو بھی کچھ ہوتا، ناگہاں ہوتا



میرا اپنا

(منصورہ بیٹی کی نذر)

ریت اور برف پہ نقشِ کفِ پا میرا ہے
میں نے ہر سمت میں، ہر ملک میں ہر موسم میں
جستجو کی ہے کہ شاید کوئی اپنا مل جائے
کوئی وہ جس کے قریب آ کے یہ محسوس کروں
زندہ رہنے کا مجھے بھی کوئی حق حاصل ہے
میں جو زندہ ہوں تو بے وجہ نہیں زندہ ہوں
اب یہ محسوس ہوا ہے مجھے، اک عمر کے بعد
اجنبی جو نظر آیا تھا، وہی اپنا ہے
وہ جو بے لوث ہے پانی میں کنول کی صورت
جو محبت کے سوا کچھ بھی نہیں دے سکتا
جو محبت کے سوا کچھ بھی نہیں لے سکتا



مرضی شاہ کی کب تک

مرضی شاہ کی کب تک رہ دشوار چلیں
اب اناالحق ہی کہیں اور سردار چلیں

یوں بجا لاتے ہیں ہم عدل کشی کے احکام
جیسے بیگار میں پکڑے ہوئے نادار چلیں

اس طرف بھی تو یہی چرخ ستمگر ہو گا
یوں تو سب چاہتے ہیں' بحر کے اس پار چلیں

جب بھی جی چاہے کبھی شہر بدر ہونے کو
میرے ہمراہ مرے کوچہ و بازار چلیں

دل میں اس طرح ٹہلتی ہیں کسی کی یادیں
جیسے گلزار کے ماحول میں دلدار چلیں

ہم تو صحرا سے بھی گزرے تھے صبا کی صورت
آج کے لوگ تو طوفان کی رفتار چلیں



ہر تغیر سے ماورا ہونا

ہر تغیر سے ماورا ہونا
کتنا دشوار ہے خدا ہونا

کوئی کہتا نہیں بروں کو برا
کتنا اچھا رہا برا ہونا

پیار بھی جب ہو جنس بازاری
اک عجوبہ ہے باوفا ہونا

مجھ کو پاس گناہ آدم ہے
سہل تھا ورنہ پارسا ہونا

قتل کے حادثے سے کم تو نہیں
پھول کا شاخ سے جدا ہونا

اک بغاوت ہے ایک نیکی ہے
حبس میں موجہ ہوا ہونا

میرے فن سے ندیم ثابت ہے
میری مٹی کا کیمیا ہونا



ستارے تیری مژہ پر اترنے

ستارے تیری مژہ پر اترنے والے ہیں
کہ کائنات کے تیور بدلنے والے ہیں

میں دیکھتا ہوں تری آنکھ نم تو سوچتا ہوں
سمندر اپنی حدوں سے اچھلنے والے ہیں

شب فراق کا آغاز ہونے والا ہے
فضا خموش ہے اور سائے ڈھلنے والے ہیں

پیالے ہاتھوں میں یوں لے رکھے ہیں پیاسوں نے
کہ جیسے ریت سے چشمے ابلنے والے ہیں

کبھی کبھی تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے
بدلنے والے ہیں یہ دکھ نہ ٹلنے والے ہیں



عجب سرور ملا ہے مجھے

عجب سرور ملا ہے مجھے دعا کر کے
کہ مسکرایا خدا بھی، ستارہ وا کر کے

گداگری بھی اک اسلوب فن ہے، جب میں نے
اسی کو مانگ لیا اس سے التجا کر کے

شب فراق کے ہر جبر کو شکست ہوئی
کہ میں نے صبح تو کر لی خدا خدا کر کے

یہ سوچ کر کہ کبھی تو جواب آئے گا
میں اس کے در پہ کھڑا رہ گیا صدا کر کے

یہ چارہ گر ہیں کہ اک اجتماع بد ذوقاں
وہ مجھ کو دیکھیں تری ذات سے جدا کر کے

خدا بھی ان کو نہ بخشے تو لطف آ جائے
جو اپنے آپ سے شرمندہ ہوں، خطا کر کے

خود اپنی ذات پہ تو اعتماد پختہ ہوا
ندیم یوں تو مجھے کیا ملا وفا کر کے



جو دلربائی کا جادو

جو دلربائی کا جادو ترے جمال میں ہے
مری نظر میں ہے یا تیرے خدو خال میں ہے!

میں تیری یاد کے دم سے مہکتا رہتا ہوں
تو گل ہے اور مرے دامن خیال میں ہے

جو تجھ کو دیکھے وہ خالق کی حمد کرنے لگے
عجب کمال ترے حسن بے مثال میں ہے

مرے سوال کا دشوار تو نہیں ہے جواب
کہ یہ جواب تو پنہاں مرے سوال میں ہے

میں اک ذرہ سا جو آسودہ ہوں عذاب میں ہوں
کہ ذہن کرب میں ہے اور دل و بال میں ہے

غروب مہر جہاں تاب کا جلال تو دیکھ
تری بھی عمر اگر منزل زوال میں ہے



انجام برا ہوا انا کا

انجام برا ہوا انا کا
در بند ملا مجھے خدا کا

میں تکتا رہا ہوں شام تا شام
رستہ کسی دیر آشنا کا

دلہن کی ہتھیلیوں سے پوچھو
کیوں زرد رہا اثر حنا کا

گلشن ہوں، کھلنڈر ہوں یا خرابے
رکتا ہی نہیں سفر ہوا کا

نکلیں اگر ابتدا سے ہم لوگ
تب مرحلہ طے ہو انتہا کا

زیتون کی شاخ کو سنبھالو
پر ٹوٹ گیا ہے فاختہ کا

چڑیاں بھی خموش ہو گئی ہیں
شاید یہی وقت ہے دعا کا!



یہ عجب دل ہے

یہ عجب دل ہے کہ آباد ہے دنیا اس میں
اک سے اک بڑھ کے مگر حشر بھی برپا اس میں

زندگی ایک مسافر سی مجھے لگتی ہے
دل دھڑکتا ہے تو قدموں کی صدا ہے اس میں

زہر کے صاف نظر آتے ہیں ساغر میں نقوش
اور مصر ہے مرا ساقی کہ شفا ہے اس میں

نصف شب کو ہی اگر سارے دیے بجھ جائیں
کون بتلائے کہ کس کس کی خطا ہے اس میں

ظلمت شب میں تو سایہ بھی بچھڑ جاتا ہے
صرف سورج کی رفاقت سے وفا ہے اس میں

بلبلے سے جو اڑنے کا سبق لیتے ہیں
پہلے یہ سوچ تو لیں صرف ہوا ہے اس میں

حبس موسم کا ہو یا ذہن کا .... اس عالم میں
لو بھی چلتی ہو تو انداز صبا ہے اس میں



ایک پل ایسا بھی آجاتا ہے

زخم پر زخم دیے جاتے ہو
نہ جھجکتے ہو نہ شرماتے ہو
زخم دینا بھی، نہ پچھتانا بھی
وار پر وار کیے جانا بھی
بے حیائی مسند ہوتی ہے
تم کو معلوم نہیں ہے شاید
زخم کھانے کی بھی حد ہوتی ہے
ایک پل بھی ایسا بھی آ جاتا ہے
زخم دیتا ہوا جلاد کا ہاتھ
اٹھ کے نیچے نہیں آ پاتا ہے
ایک مفلوج کے بازو کی طرح
حشر تک کے لیے تھم جاتا ہے
آنے والے کئی نسلوں کے لیے
ایک عبرت کی علامت بن کر
صفحہ وقت یہ جم جاتا ہے



بولنے دو

بولنے سے مجھے کیوں روکتے ہو؟

بولنے دو کہ مرا بولنا دراصل گواہی ہے مرے ہونے کی

تم نہیں بولنے دو گے تو میں سناٹے کی بولی میں ہی بول اٹھوں گا

میں تو بولوں گا

نہ بولوں گا تو مر جاؤں گا

بولنا ہی تو شرف ہے میرا

کبھی اس نکتے پہ بھی غور کیا ہے تم نے

کہ فرشتے بھی تمہیں بولتے ۔۔۔۔۔۔ میں بولتا ہوں

حق سے گفتار کی نعمت فقط انساں کو ملی

صرف وہ بولتا ہے

صرف میں بولتا ہوں

بولنے مجھ کو نہ دو گے تو مرے جسم کا ایک ایک مسام

بول اٹھے گا

کہ جب بولنا منصب ہی فقط میرا ہے

میں نہ بولوں گا تو کوئی بھی نہیں بولے گا!



کوئی وعدہ اگر پورا

کوئی وعدہ اگر پورا نہ ہوگا
تو کیا اب حشر بھی برپا نہ ہوگا

محبت کرنے والے تو بہت ہیں
کوئی مجھ سا، کوئی تجھ سا نہ ہوگا

جمال یار کا اجمال یہ ہے
سنا ہو گا مگر دیکھا نہ ہو گا

کوئی ابلیس ہے، کوئی فرشتہ
تو کیا اب آدمی پیدا نہ ہوگا؟

جہنم میں جلے کیوں اس کا شہکار
خدا کچھ بھی ہو، پرایسا نہ ہوگا

ندیم اتنی بھی شہرت ہے مصیبت
کوئی تجھ سے بڑا تنہا نہ ہوگا



لالہ صحرا

عصرِ حاضر کی تہذیب کے دور تک پھیلے صحراؤں میں
آندھیاں چل رہی ہیں
اس کی تاریخ ٹیلوں کی صورت یہاں سے وہاں سر پٹختی نظر آ رہی ہیں
اور ہوا ریت کے تند چھینٹے اڑاتی
مرے خیمہ دل کے چاروں طرف
اک بھنور سا بنانے میں مصروف ہے
یہ وہ خیمہ ہے
جس کی طنابوں پہ جھونکے قیامت کی شدت سے جب ٹوٹ پڑتے ہیں
چیخوں کی آواز آتی ہے
جیسے بہت سے فرشتے
فلک سے اترتے ہوئے رو رہے ہیں!
مگر میری نظریں فقط ایک نقطے پہ جم سی گئی ہیں
وہاں ایک لالے کا پھول
ایک عجب جرات و بے نیازی سے
ایک ایک پتی سنبھالے ہوئے
سر اٹھائے کھڑا ہے



سرزمین عرب

سرزمین عرب!

تیری پیغمبرانہ فضاؤں میں

صدیوں کے بعد

اک نیا رقص ابلیس ہونے لگا ہے

مگراس کا مفہوم ماضی سے کچھ مختلف بھی نہیں ہے

کہ اب بھی ترے ریگ زاروں میں فرزند تیرے

سلگتی ہوئی ریت پر

نسل ابلیس کو بھون ڈالیں گے

جس طرح مکی کے دانے

بھڑکتی ہوئی آگ کی آنچ پر

تلملاتے ہیں

اور پھر تڑپتے ہیں

اور پھر چٹختے ہیں

آخر میں خاموش ہونے کے بعد

ان کے چہروں کی فق اور ویران اوراق پر

ایک تحریر ابھرتی ہے

''ہم کو یہ انجام تو صدیوں پہلے سی معلوم تھا!''



اپنے اندر جو ڈوب کر دیکھا

اپنے اندر جو ڈوب کر دیکھا
مدتوں بعد ایک بشر دیکھا

اس طرف دیکھنے کی تاب کسے
جس طرف میں نے عمر بھر دیکھا

کاش وہ دیکھتا مری آنکھیں
میرا دامن جو اس نے تر دیکھا

گل ہے شہکار فن مگر میں نے
خار کو بھی نہ بے ہنر دیکھا

زندگی کٹ گئی بگولوں میں
دشت در دشت اپنا گھر دیکھا

شب نے سارا لہو نچوڑ لیا
تب کہیں جلوہ سحر دیکھا



ہوانے گھر کا دروازہ

ہوا نے گھر کا دروازہ بجایا
میں حیران تھا، مرے ہاں کون آیا

مجھے اپنا بنایا صرف اس نے
جو تھا دنیا کی نظروں میں پرایا

جب اپنا عشق پہنچا انتہا تک
تو ہر انساں کو سینے سے لگایا

میں سرگرداں ہوں اپنی جستجو میں
مجھے کوئی اشارہ دے، خدایا!

سدا سے روشنی منزل ہے میری
سدا پیچھے رہا ہے میرا سایا

الٰہی! داد دے حسن نظر کی
تری شب میں دیا میں نے جلایا

ندیم اس عہد کا یہ المیہ ہے
موحد نے خدا کو بت بنایا



عالمی نظامِ نو

سات سمندر پار سے اک فرمان آیا ہے
''ہم نے تمہیں آزاد کیا تھا
لیکن یہ آزادی ایسی ویسی آزادی تو نہیں تھی
تم جیسے نااہلوں نے تو
سلطنتوں کو بھی اونے پونے نیلام کیا
ہم نے تمہیں جو آزادی بخشی تھی
اس کے ضائع جانے کا خطرہ ہے
اس لیے ہم نے
سات سمندر پار سے اپنے لشکریوں کو لانے والے ہیں
یعنی ہم جانے والے پھر سے آنے والے ہیں''



تراشیدم پرستیدم شکستم

بت تراشی کا جو فن ہے کوئی ہم سے سیکھے
تو وہ سنگ کو انسان کی صورت دے کر
ہم اسے پوجتے ہیں
اور پھر پھول چڑھاتے ہیں چراغاں کر کے
جیسے اس بت کے بغیر
نا مکمل تھے ہمارے ایماں
اور ادھورے تھے عقیدے سارے
بت شکن بھی تو نہیں کوئی ہمارے جیسا
آرزو کوئی نہ پوری ہو تو ہم گرز اٹھا لاتے ہیں
اپنے تیشے سے تراشیدہ صنم کے سر پر
اس طرح ضرب لگاتے ہیں کہ سب دیکھتے رہ جاتے ہیں
ہم وہ بت گر ہیں جو خود اپنے ہی فن کا لاشہ
اپنی تاریخ کے قبرستاں میں
اک نئی قبر کی صورت میں چھپا آتے ہیں



آبادی کا مسئلہ

ہم دنیائے نو والے
تہذیبوں کے رکھوالے
گہری سوچ میں ہیں
مسئلہ آبادی کا حل کیا ہوگا!
اتنے غیر سفید کروڑوں اربوں کو کس طرح سپردار کریں
اتنے کروڑوں اربوں رسوں پر تو ڈھیروں ڈالر اٹھ جائیں گے
اتنی شہ خرچی کی گنجائش ہی کہاں ہے
ان حالات میں لے دے کر بس ایک ہی نسخہ کارآمد ہے
زندہ رہنے کو ہم اتنا مہنگا کردیں
ہر شے کے نرخوں کو اتنا اونچا کریں
غیر سفید افراد اگر اچھلیں کودیں بھی
چھو بھی نہ پائیں ان نرخوں کو
یوں آہستہ آہستہ یہ سطح زمیں کے بوجھ کو ہلکا کرتے جائیں گے
ہم پر بھی الزام نہ ہوگا اور یہ اپنے آپ ہی مرتے جائیں گے
پھانسی دینا ویسے بھی کچھ اچھا فعل نہیں ہے!



ڈپریشن

کہاں گئی ہیں وہ صبحیں کدھر گئیں شامیں؟
کہاں گئے وہ طلوع و غرب کے منظر؟
نہ ظلمتیں، نہ اجالے، نہ رات اور نہ دن
یہاں سے حد نظر تک ہے ملگجی سی فضا
بچھا ہوا ہے زمیں پر بسیط سناٹا
صدا کہیں سے بھی آتی نظر نہیں آتی
سماعتوں پہ گھنی خامشی کے پہرے ہیں



مجروح

جہاں بھی ہاتھ لگایا تمام زخم تھا جسم
مری قبا سے تو ملبوس قیس بہتر تھا
خراشیں سر سے مری ایڑیوں تک آ پہنچیں
ادھر سے تیر چلے اور ادھر سے شمشیریں
کہیں ہے ضرب تبر کی کہیں ہے نیزے کی
میں اک جہاں کا ہدف ہوں، مجھ سے جیتے جی
کسی بھی ظلم کی تائید کا نہ جرم ہوا
میں بارگاہ شہی میں بھی سربلند رہا



آئینے سے تیرا کیا ناتا

آئینے سے ترا کیا ناتا ہے
ہر کوئی دیکھتا رہ جاتا ہے

اب تو اتنا بھی مجھے یاد نہیں
کون ہر شب مجھے یاد آتا ہے

انتہا دیکھئے سناٹے کی
چار جانب کوئی چلاتا ہے

مستقل تم بھی نہیں میں بھی نہیں
وقت آتا ہے گزر جاتا ہے

میں تو اک پیکر موسیقی ہوں
میری رگ رگ میں لہو گاتا ہے

ہجر کی رات قیامت ہے ندیم
چاند گرتا سا نظر آتا ہے



بس اتنا یاد ہے

بس اتنا یاد ہے
میں نے یہیں
ان راستوں کی جھاڑیوں کے پھول سونگھے تھے
یہیں قرنوں کے اس پار ایک صورت میں نے دیکھی تھی
جسے پہچاننے میں چند صدیاں صرف کیں میں نے
سلونا سا وہ چہرہ
اور روشن سی وہ آنکھیں
آج بھی میرا اثاثہ ہیں
مگر میں سوچتا ہوں یہ کہیں پھولوں کی خوشبو کی شرارت نہ ہو
خوشبو گلوں کی ہو کہ جسموں کی
ہمیشہ رات کو دن
اور دن کو رات کا نقشہ دکھاتی ہیں
طلسم اس کا جب انسانوں کے باطن میں اترتا ہے
تو ایسی صورتیں تخلیق کرتا ہے
جنھیں پہچاننے میں چند صدیاں صرف ہوتی ہیں



تسلسل

اب کے برسات عجب طور سے گزری مجھ پر
بارشِ سنگ نے دھرتی کو دھنک ڈالا ہے
بوندیں یوں گرتی ہیں فولاد کی چادر پہ چٹانیں جیسے
دور تک پھیلتی وسعت میں جو تصویریں بنائی تھیں کسانوں نے
ہری زرد سنہری بھوری
ان میں در آئی ہیں معصوم لہو کی دھاریں
اور انسان
وہ تخلیق کا شہکار عظیم
اس کے تو چیتھڑے اڑتے ہوئے دیکھے میں نے
کچھ بزرگوں نے یہ ارشاد کیا ہے
کہ یہ سب قہر خداوندی ہے
اور کل خواب میں جب
خالق ارض و سما سے مری مڈھ بھیڑ ہوئی تو میں نے
سجدے کے بعد ادب سے یہ شکایت کر دی: تو فقط قہر نہیں' مہر بھی ہے
پھر یہ شاداب زمینوں کے ادھڑتے ہوئے بخیئے کیا ہیں؟
اور آفاق در آفاق امڈتی ہوئی آواز کی یہ گونج سی دامان سماعت پہ
گری
پھول جس شاخ پہ مرجھاتا ہے
پھر اسی شاخ پہ اگ آتا ہے



اب رب سماوت!

اس سمندر کا تو ساحل نظر آتا ہی نہیں

چاند جانب سی امڈتے ہوئے طوفان چلے آتے ہیں'

میری کشتی جو فقط بلبلہ لگتی ہے افق تا بہ افق لہروں پر

کتنے پہروں سے ہے اک رقص اجل میں مصروف

بادیاں کھولنا بھی ایک قیامت ہے' کہ جب کھلتے ہیں

دھجیاں بن کے بکھر جاتے ہیں

شوکتی ہونکتی ہر آن بپھرتی ہوئی موجوں کے سوا

زندگی کی کوئی آواز کہیں سے بھی نہیں آپاتی

کچھ نہیں اور تو آفاق کی پہنائی میں

کوئی چکرایا ہوا آبی پرندہ ہی نظر آجائے

اس زمیں پر مجھے

اے رب سماوات

کوئی ایک بہانہ تو ملے جینے کا!



سب بھٹکتے ہیں ٹھکانے

سب بھٹکتے ہیں ٹھکانے کے لیے
اور سب آتے ہیں جانے کے لیے

آدمی نے پوری جنت ہار دی
صرف اک گندم کے دانے کے لیے

ابتدائی بول ہی سوجھا نہیں
ورنہ کیا کچھ تھا سنانے کے لیے

ذبح کر بیٹھے خود اپنی ذات کو
تم جو زندہ تھے زمانے کے لیے

صف بہ صف گرنے لگی ہیں بجلیاں
اک ذرا سے آشیانے کے لیے

زندگی بھر آگ پھانکی ہے ندیم
اک دیا دل کا جلانے کے لیے



جلتے صحراؤں پہ کیوں چھائیں

جلتے صحراؤں پہ کیوں چھائیں گھٹائیں تیری
ان کی خدمات سے نہ تپ جائیں ہوائیں تیری

مجھ کو یا رب مری عریاں بدنی کی سوگند
دین و دنیا پہ تو لپٹی ہیں قبائیں تیری

سنسناتے ہیں خلاؤں میں ترے سیارے
ان کی گردش سے میں سنتا ہوں صدائیں تیری

میں نے جو جرم کیے میری جبلت تھے مگر
میرے اللہ! قیامت ہیں سزائیں تیری

اے گنہ گار انا! حشر بپا ہونے تک
آسمانوں پہ نہ پہنچیں گی دعائیں تیری



تاریخ

یہ لمحہ جو گزر رہا ہے
اس کو ماضی بننے میں
صرف ایک لمحہ لگتا ہے
وقت مثال ہے ایک بڑی مقراض کی
جس نے
لاکھوں اور کروڑوں صدیوں سے
لمحوں کو کتر کتر کر
اربوں کھربوں سنکھوں کا اک ڈھیر لگا رکھا ہے
اور پھر اس ملبہ پر
انسانوں کی بے خبری کا عطر چھڑک کر
نام اس کا تاریخ رکھا ہے



دستک یہ کمال کر گئی

دستک یہ کمال کر گئی تھی
اک پل میں صدی گزر گئی تھی

پھر نور کا اک وفور سا تھا
اس تک تو مری نظر گئی تھی

کس دل سے اسے وداع کرتا
آنکھوں میں تو ریت بھر گئی تھی

میں بڑھ نہ سکا افق سے آگے
ہاں گرد سفر مگر گئی تھی

دن کی بھی پکار پہ نہ ملی
وہ رات جو میرے گھر گئی تھی

سینے پہ پہاڑ بن کے اتری
فریاد جو بے اثر گئی تھی

کلیاں بھی چٹکنا بھول بیٹھیں
پت جھڑ سے بہار ڈر گئی تھی



کرۂ ارض

یہ زمین کتنی اکیلی تھی

جب آدم ابھی تخلیق کے بحران میں تھا

کتنے سناٹوں کے انبار لدے تھی اس پر

کتنی صبحیں تھیں

جو انوار لٹاتی ہوئی آتی تھیں

مگر کوئی انھیں دیکھنے والا ہی نہ تھا

کتنی شامیں تھیں

جنھیں دست شفق حسن کے مفہوم بجھاتا تھا

مگر کوئی انھیں جانچنے والا ہی نہ تھا

پھول کھلتے تھے تو حیران نظر آتے تھے

اپنے ہی پھیلتے گھٹتے ہوئے سایوں کی طرف دیکھ کے ڈرتے تھے شجر

اور دریا تھے تو یوں بہتے تھے

جیسے بیگار میں پکڑا ہو عناصر نے انھیں

بحر کی سطح کچھ اس طرح سے لرزاں تھی کہ جیسے اس نے

اپنی گہرائی میں جھانکا ہو تو کانپ اٹھی ہو

چاند روٹھا ہوا بچہ تھا تو خورشید کو تنور کی مانند بھڑکنے کے سوا

اور کوئی کام نہ تھا

یہ زمیں تھی کہ کوئی دشت پر اسرار تھا آسیب زدہ

حکمراں اس پہ وہ تنہائی تھی

جو ازل اور ابد کی طرح ابہام کے تابوت میں آسودہ تھی

تب وہ مخلوق زمیں پر اتری
اپنے ہمراہ جو لے آئی محبت کا طلسم
پھر تو ہر چیز کا ہر چیز سے پیدا ہوا اک ربط لطیف
پھول مہکار لٹاتے تھے تو اشجار کو وجد آتا تھا
چاند کے نور کو پیتا تھا تو انگڑائیاں لیتا تھا سمندر کا شباب
شبنمیں جانب خورشید سفر کرتی تھیں
شامیں تھپکاتی تھیں اور صبحیں پرندوں کے اٹھائے ہوئے ساز یئے
جگانے کے لیے آتی تھیں
گہما گہمی کا وہ عالم تھا
کہ ہر چیز توانائی کی تجسیم نظر آتی تھی
اور خدا وقت کے آئینے میں
اپنی تخلیق کی رعنائیاں جب دیکھتا تھا جھومتا تھا
لیکن اے اہل جہاں
یہ جو ہر شہر کے مرکز میں صلیبوں پہ گڑے ہیں ڈھانچے
یہ جو ہر موڑ پہ عریاں بدنی بکتی ہے
اور تعفن بھری آغوش میں معصومتیں ٹوٹ کے رہ جاتی ہیں
یہ جو اک لقمہ تر کے لیے چھن جاتا ہے کھیتوں کا سہاگ
یہ جو اک شخص کے قبضے میں رکھا رہتا ہے لاکھوں کا وجود
صبحیں انوار لٹاتے ہوئے نغمات سناتے ہوئی گھبراجاتیں
شامیں تاروں کے کفن اوڑھ کے مرتی رہتیں
پھول کھلتے تو فقط اس لیے کھلتے کہ انھیں کھلنا تھا
اور اشجار پہ اک ہول سا طاری رہتا
سر دریا کوئی سایہ بھی نہ آنے پاتا
بحر پر غیظ سے بھری ہوئی موجوں کے بگولے چلتے

سورج اور چاند سر مصحف افلاک

چمکتے ہوے دھبے ہوتے

ابن آدم سر فردوس بریں

اپنے خدام فرشتوں کے جلو میں چلتا

اور زمیں دوسروں سیاروں کی مانند

فقط گردش بے سود میں تا حشر بھٹکتی رہتی!



کھوج

ماؤں کی گودیں اجڑ رہی ہیں مانگیں بکھر رہی ہیں
کیسی رتیں میرے شہروں پر پل پل اتر رہی ہیں

دن کیوں سنائے بانٹیں کیوں راتیں چیخیں ماریں
میری صبحیں کیوں سسکیں مری شامیں کسے پکاریں

کون ہیں وہ جو نوچ کے لے گئے میرا رنگ گلابی
کس نے بھری میری آنکھوں میں عمروں کی بے خوابی

کس نے میرے باغ لتاڑے کس نے پھول چرائے
کس نے میرا سبزہ روندا کون یہ خاک اڑائے

کھوج لگاتا میں دیوانہ شیش محل تک آیا
ہر جانب فولاد گڑا تھا کوئی نہ رستہ پایا

بیٹھا رہوں گا میں بھی مرتے دم تک تاک لگائے
شاید اک دن میرا لیٹرا محل سے باہر آئے



تیری جانب سفرِ حیات مری

تیری جانب سفرِ حیات مری
تو مرا ہے تو کائنات مری

عکس در عکس تو نظر آئے
بٹ گئی آئنوں میں ذات مری

اپنی اپنی ہماری مملکتیں
سارا دن تیرا، ساری رات میری

پوری دنیا سراپا استعجاب
سن کے اک سیدھی سادی بات مری

میں کہ مسجود ہوں فرشتوں کا
عرش تک حد ممکنات مری

میرا اندر ہزار دنیائیں
اور پھر ان گنت جہات مری

میرا فن میرے بعد بھی زندہ
یوں ہوئی موت سے نجات مری

اپنے باطن کا ترجماں ہوں ندیم
میرا ہر شعر واردات مری



یوں تو بستی اجڑ کر بھی

یوں تو بستی اجڑ کر بھی بستی رہی
زندگی زندگی کو ترستی رہی

مرمریں چھت پہ بوندیں رہیں رقص میں
کچے گھر پر قیامت برستی رہی

ہاتھ نکلا نہ کیسے سے قارون کا
اس کی تقدیر میں تنگ دستی رہی

لاکھ غوغا ہو ہر سمت مہنگائی کا
آدمیت تو سستی کی سستی رہی

عمر کٹتی رہی پیار کی چھاؤں
دھوپ مجھ کو بظاہر جھلستی رہی



ایک یادگار روزن

میری یادوں میں سے اک یاد مجھے
تادمِ مرگ نہیں بھولے گی
میری اس یادکا روزن وہ دریچہ ہے کہ جس میں سے مجھے
کتنے گزرے ہوئے پل صاف نظر آتے ہیں
کچی مٹی کو جو تختی پہ چلاؤں تو یہ دھرتی جیسے
اپنی خوشبو میں مجھے نہلائے
روشنائی میں قلم کو جو ڈبوؤں
تو مجھے روزِ ازل یاد آئے
لفظ لکھوں سرِ قرطاس
تو پھولوں کی قطاریں لگ جائیں
حرف کے دائرے سیارے سے بنتے جائیں
اور نقطے وہ چمکتے ہوئے تارے
جو کبھی تیرتے ہیں اور کبھی ڈوبتے ہیں
میرے ماضی کا یہ روزن مجھے دکھلاتا ہے
ہر سو غنچے
وہ جو تخلیق کے موسم میں چٹکتے ہیں
تو ہر رنگ کے دلدار مفاہیم کے انبار سے اُگ جاتے ہیں
میرے ماضی کا یہ وہ روزن ہے
جس میں جھانکو تو وہاں
جھٹپٹے اور شفق اور طلسمی سی، الوہی سی خوشی کی فضا طاری ہے
اور اک سمت اندھیرے میں دمکتے ہوئے چہروں کی ندی جاری ہے

یہ وہ منظر ہے کہ جو
علم و منطق کے صحیفوں سے کئی لاکھ گنا بھاری ہے



ہر لحہ یہ پیچ و تاب

ہر لحہ یہ پیچ و تاب کیسا
ہے وقت بھی ہم رکاب کیسا

تکلتا ہے سمندر اس کا رستہ
دریا کا پھر اضطراب کیسا

مجبور ہے جب بشرؔ تو یارب!
اعمال کا پھر حساب کیسا

جب خیر ہی اجر ہے خود اپنا
پھر فلسفہ ثواب کیسا

ہر چیز جہاں بھی تھیؔ وہی ہے
پھر مژدہ انقلاب کیسا

اب حادثہ غروب کے بعد
کل نکلے گا آفتاب کیسا

میں زندگی بھر جلا بجھا ہوں
دوزخ کا ہے پھر عذاب کیسا



وہ جو اک چیز ہے

وہ جو اک چیز پس پردہ ظاہر ہے
وہ کیا ہے؟
کون باطن کے نشیبوں کو کھنگالے
کہ جو باطن میں اترتے ہیں
وہ واپس نہیں آنے پاتے
اور یہ چیز بلاتی ہے مجھے
دن کا ہنگامہ ہو یا رات کا سناٹا ہو

ایک آواز
مسلسل
مرے کانوں سے گزر کر
مرے وجدان میں گھل جاتی ہے
اور پھر گونجتا ہے میرا وجود

کون ہے تو؟
کہ ترے مس میں جو حدت ہے
مری روح کو کھولاتی ہے
کون ہے تو؟
کہ مرے غرفہ باطن پہ تری حلقہ زنی نے
مجھے اک عمر سے سونے نہ دیا
کوئی احساس ہے تو

یا کوئی جذبہ ہے
کوئی وہم ہے
آسیب ہے
آخر کیا ہے؟
تو کہیں میرا یہ بے چین تجس تو نہیں
کہ مجھے کس نے سزا دی ہے جئے جانے کی
اور مرنا بھی ضروری ہے تو کیوں
جبکہ خدا باقی ہے
اور باقی سے فنا کی مجھے امید نہیں ہو سکتی
پھر پس پردہ ظاہر
یہ کچوکوں کا تسلسل کیا ہے؟
میرے اللہ!
وہ کیا چیز ہے جس نے مجھ کو
روز اول سے بس اک دانہ اسپند بنا رکھا ہے
یہ کہیں تو تو نہیں؟



ذرہ

میرا ہر ذرہ کرہ ہے
جو ہے گردش میں اسیر
ایک گردش بھی جو ٹوٹے تو قیامت آجائے
لوگ کہتے ہیں کہ تم کیا ہو
فقط مٹی ہو
وہ نہیں سوچتے، مٹی تو ہے ذروں کا ہجوم
اور ہر ذرہ ہے گردش میں اسیر
گردشیں حضرت انسان کے پیکر میں مجسم ہیں
مگر یہ تجسیم
حشر ناگاہ کا امکان لیے پھرتی ہے

میں نے خود اپنے ہی اک اچٹے ہوئے ذرے کو توڑا
تو مرا شعر ہوا ہے تخلیق
اور اس دور کے داناؤں کا کہنا ہے
کہ ذرے میں وہ جوہر بھی ہے
دوزخ کو جو جنت میں بدل سکتا ہے



ہم اس لئے بھی تو بازیچہ

ہم اس لیے بھی تو بازیچہ حیات بنے
کہ کوئی عذر تو بنیاد انبساط بنے

جو مر گئے ہیں وہ انسان بھی شمار کرو
کروڑوں سال جو گزرے ہیں کائنات بنے

فنا کے گھاٹ اترتے رہے یہ سوچ کے لوگ
کسی بہانے کوئی حیلہ ثبات بنے

فقط فریب نظر ہیں شمال اور جنوب
اسی طلسم کے دھوکے میں شش جہات بنے

یہ ظلمتیں بھی تو تخلیق کے کرشمے ہیں
ہزاروں روشنیاں جب بجھیں تو رات بنے

نہ پوچھ ہم سے حقیقت کی جستجو کا مآل
کہ پختہ تر جو یقیں تھے توہمات بنے

ندیم رمز و رعایت کے پینترے نہ دکھا
سخن کی آگ جو دل میں جلے تو بات بنے



دھرتی پہ اب آسماں

دھرتی پہ اب آسماں گرا دے
یوں عرش کو فرش سے ملا دے

کس دشت میں، کس مقام پر ہوں
اے میری انا! مجھے صدا دے

کانٹوں سے تو بھر دیا ہے آنگن
اک پھول بھی، اے خدا کھلا دے

یاد آ مگر اتنا بھی نہ یاد آ
کچھ مجھ کو جدائی کا صلہ دے

یہ تیری جفا کا شاہ پارہ
ہر پل ترے ظلم کو دعا دے

دستک کا جواب چاہتا ہوں
در کھول کے صرف مسکرا دے

پیاسا تو میں ہوں ندیم کب کا
پانی مگر آگ سی لگا دے



اختر حسین جعفری کے لیے چند شعر

دل میں سوچا تھا کہ ہم عمر بسر کر لیں گے
تجھ سے نظمیں تری سنتے، ترے نغمے گاتے

بس جو چلتا تو ہم اس دور کے ویرانوں پر
چار جانب سے تری نکہت فن برساتے

ہم نے کوشش تو بہت کی، مگر اے یار عزیز
تیرے اوصاف نہیں ہم سے سمٹنے پاتے

یہ حقیقت ہے مسلم کہ ہر اچھا شاعر
اپنی تمثال تو دے جاتا ہے جاتے جاتے

بزم فن میں ترا کوئی بھی نہ ہمسر نکلا
ہم ترے بعد کہاں سے ترا ثانی لاتے



ایک ماحول اچھوتا چاہوں

ایک ماحول اچھوتا چاہوں
صحن کے نام پہ صحرا چاہوں

موج دریا جہاں چاہے لے جائے
ناخدا کا نہ سہارا چاہوں

کائناتیں مرے خوابوں کی اسیر
اور قدرت سے میں کتنا چاہوں

تربیت میری زمیں نے کی ہے
میں خلاؤں میں لپکنا چاہوں

بخشوانے کو گناہ آدم
پھر سے فردوس میں جانا چاہوں

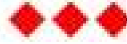
دوزخ انسان پہ ہو جائے حرام
رب سے یہ وعدہ فردا چاہوں

خشک پتے نہ شجر سے چھنیے
بس یہ احسان ہوا کا چاہوں

میری ضد کون کرے گا پوری
شام کو صبح کا تارا چاہوں

میرا ہر کام الگ دنیا سے
جس کو چاہوں اسے تنہا چاہوں

ہجر کی کتنی تمازت ہے ندیم
اب کسی یاد کا سایا چاہوں



بے بسی کے ایک لمحے کی نظم

صبح کی سیر پہ جاتے ہوئے میں آج کہاں آ نکلا
جتنے کہسار ہیں دھرتی میں دھنسے جاتے ہیں
جھیل کی سطح پہ پتھر کا گماں ہوتا ہے
ریت اڑتی نظر آتی ہے گلستانوں میں
اور غنچہ جو چٹکتا ہے تو گندھک کا دھواں چھوڑتا ہے
دست اشجار میں پتے نہیں انگارے ہیں
جھاڑیاں دور سے عفریت نما لگتی ہیں
گھاس پر اوس اترتی ہے تو جل جاتی ہے
اور بے سمت ہوا
راہ گم کردہ مسافر کی طرح چلتی ہے
جس طرف جاتا ہوں ٹوٹے ہوئے انسان نظر آتے ہیں
سر کہیں ہاتھ کہیں پاؤں کہیں
خاک پر چار طرف بکھری پڑی ہیں آنکھیں
جس طرف قصر مشیت کی فلک بوس فصیلوں کے سوا کچھ بھی نہیں



یکسانیت

میں آنکھ دریچے بند کروں یا کھولوں' ایک ہی منظر ہے
باہر بھی قیامت برپا ہے' اندر بھی حشر کا عالم ہے
باہر جب پت جھڑ کے ہاتھوں پیڑوں کا لباس اترتا ہے
اندر کے دشت بھی ڈھیروں زرد پتاور سے اٹ جاتے ہیں
باہر جب حد نظر تک پھیلا ساگر موجیں مارتا ہے
اندر کے سمندر میں بھی بھنور پڑتے ہیں' کنارے کرتے ہیں
باہر جب تار ٹوٹتا ہے' اندر کوئی نس پھٹ جاتی ہے
باہر جب آنکھیں بھیگ چلیں' اندر چپ سی چھا جاتی ہے
میں آنکھ دریچے بند کروں یا کھولوں' ایک ہی منظر ہے



جیسے لفظوں کو تراشا گیا

جیسے لفظوں کو تراشا گیا انگاروں سے
اب تو بارود کی بو آتی ہے اخباروں سے

قصر سلطاں کی فلک بوس فصیلوں پہ نہ جا
انقلاب آئیں تو رکتے نہیں دیواروں سے

نکہتیں ہو نہیں سکتیں کبھی رنگوں کی اسیر
قدغنیں پھاند کے آ جاتی ہیں گلزاروں سے

روح فرہاد نہ ہو کوہ کنی میں مصروف
یہ جو تیشے کی صدا آتی ہے کہساروں سے

حسن بے ساختہ پن سے ہی نمو پاتا ہے
کلیاں گلشن میں چٹکتی نہیں تلواروں سے

ہم نے سجدہ کیا صرف ایک خدا کے در پر
ہم سرافراز گزرتے رہے درباروں سے

فاختائیں بھی ہیں اس دور کی آشفتہ مزاج
شاخ زیتون گرا دیتی ہیں منقاروں سے

ظرف چھلکیں تو بھگو دیتے ہیں محفل ساری
ویسے ہم کو تو کوئی کد نہیں مے خواروں سے

سامنے جن کے نکالا گیا جنت سے ندیم
جھانکتے ہیں وہی قدسی اسے سیاروں سے



زمیں کو میں نے کبھی آسماں

زمیں کو میں نے کبھی آسماں نہ ہونے دیا
متاع خاک کو یوں رائیگاں نہ ہونے دیا

صنم تراش کے، پھر اس کی گفتگو بھی سنی
کہ میں نے سنگ کو بھی بے زباں نہ ہونے دیا

میں زخم ہوں، اور اس کی داد چاہتا ہوں
لگی جو چوٹ اسے بے نشاں نہ ہونے دیا

یہ راز کیا ہے کہ ارض و سما کے خالق نے
کسی کو، اپنے سوا جاوداں نہ ہونے دیا

طفولیت میں ہے انسان مبتلا اب تک
کسی بھی دور نے اس کو جواں نہ ہونے دیا

وہ فکر جو مرے وجدان میں پنپتی رہی
مرے شعور نے اس کو بیاں نہ ہونے دیا

وہ انجماد مسلط ہے چار سُو جس نے
مرے خیال کا دریا رواں نہ ہونے دیا

بہار رک نہ سکی میرے روکنے سے ندیم
مگر چمن کو سپرد خزاں نہ ہونے دیا



صرف اپنا ہی مجھ کو آسرا

صرف اپنا ہی مجھ کو آسرا ہے
ورنہ میری دسترس میں کیا ہے

اک حشر سا حشر میں بپا ہے
بندے کو خدا کا سامنا ہے

خرمن پہ گرائی برق کس نے
افلاک پہ کون دوسرا ہے

میں اپنی زمین کا مسافر
اور چاند پہ میرا نقش پا ہے

درکار ہے دیکھنے کی جرات
ہر شخص خود اپنا آئنہ ہے

سورج کا سراغ کیا ملے گا
جب شب پہ گمان صبح کا ہے

امیدوں کے جل رہے ہیں خیمے
یا قافلہ سا لٹا پڑا ہے

دی میں نے بھی عدل کی دہائی
یہ زہر مرا چکھا ہوا ہے

ہر ظلم کو مسکرا کے سہنا
تیرا ہی ندیم حوصلہ ہے



سہارا ہے مجھے جس کے

سہارا ہے مجھے جس کے محیط کبریائی کا
اسی سے مجھ کو شکوہ ہے دعا کی نارسائی کا

مری فرد عمل پر گر فرشتے معترض ہوں گے
تو الزام ان پہ دھر دوں گا غرور پارسائی کا

سحر سورج کے رود نور سے سج کر نکلتی ہے
کہ ہے ہر خوبصورت چیز کو حق خود نمائی کا

وہ میرے پاس آئے اور جانا بھول ہی جائے
خدایا! آج کی شب تو بھرم رکھ لے خدائی کا

مرے سب درد تیری یاد کی لو میں چمکتے ہیں
سو اب تک معترف ہوں میں تری درد آشنائی کا

میں اس ویرانۂ احساس میں آسودہ خاطر ہوں
کہ تنہائی کی جنت اجر ہے تیری جدائی کا



کوئی امکاں نہیں تجھ تک

کوئی امکاں نہیں تجھ تک رسائی کا
ادا حق ہو گیا تیری جدائی کا

ہمیشہ کے اکیلے پن سے گھبرا کر
کوئی دعوی نہیں کرتا خدائی کا

مجھے تو حسن نے مبہوت کر ڈالا
غلط شہرہ ہے میری پارسائی کا

اندھیرا اور گہرا ہوتا جاتا ہے
کہ شب کو بھی تو حق ہے خود نمائی کا

اسیر زندگی کا وقت آخر ہے
اب اگلا مرحلہ ہو گا رہائی کا

میں ٹھوکر کھا کے گرتا ہوں تو یاد آئے
بہت چرچا ہے جس کی کبریائی کا

